ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی/عاصمہ رفعت
استادشعبہ اردو ،بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ، ملتان
ریسرچ سکالرشعبہ اردو ،بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ، ملتان

اُردو سفرنامے کی روایت میں جھنگ کا حصہ

Dr Mumtaz Khan Kalyani

Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Asima Riffat

Research Scholar, Bahauddin Zakariya University, Multan

The Contribution of Jhang in Tradition of Urdu Travelogue

Travelogue is an interesting and attractive genre of literature which contains illustration and narration of a journey. It traces its pedigree in centuries old Chinese literature coming down to the period of Ibn-e-Batota and Marco Polo. Gradually it became a popular genre of Urdu literature. More the means of communication were developed, numerous travelogues are available for their readers. Every travelogue depicts the style, view point and observation of the individual traveler and is also influenced by the purpose of journey, like Sir Syed Ahmad Khan who traveled to England to observe the educational and cultural aspects of the English society. This research paper traces a brief history of travelogue in Urdu literature and focuses on the anaylsis of travelogues produced by the writers belonging to Jhang District who had a late entry in travelogue writing nevertheless have created valuable literature in this genre.

سفرنامہ ایسی صنفِ نثر ہے جس میں سفرنامہ نگار کسی سفر سے حاصل شدہ معلومات، تاثرات اور مشاہدات دلچسپ انداز میں قارئین تک پہنچاتا ہے۔ سفرنامے کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ اولین سفرنامے چینیوں سے منسوب ہیں۔ یہ روایت آگے بڑھتی ہوئی ابنِ بطوطہ اور مارکوپولو تک پہنچتی ہے۔ سفرنامہ اردو کی مقبول ترین اصناف میں شامل ہے۔ اردو میں سینکڑوں سفرنامے دستیاب ہیں جن میں طبع زاد سفرناموں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے تراجم پر مشتمل سفرنامے بھی شامل

ہیں پرانے زمانے میں آمدورفت آسان نہ تھی لہٰذا سفر نامے لکھنے والوں کی تعداد بھی محدود تھی، لیکن جیسے ہی آمدورفت میں آسانیاں پیدا ہوئیں زیادہ سے زیادہ سفرنامے سامنے آنے لگے۔ جس طرح ہر انسانی شخصیت منفرد ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اُس کا زاویۂ نظر بھی مخصوص ہوتا ہے، پھر سب کے مقاصدِ سفر بھی یکساں نہیں ہوتے اس لیے سفرنامہ لکھنے کے انداز اور اسلوب بھی مختلف ہوتے ہیں۔

یوسف خان کمبل پوش کے سفر کے ساتھ ہی اردو سفرنامے کا سفر بھی شروع ہوا۔ انہوں نے دکن سے اپنے سفر کا آغاز کیا وہ پہلے لندن گئے پھر وہاں سے پیرس، جبرالٹر، مالٹا، مصر، سیلون سے ہوتے ہوئے بمبئی آئے پھر ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر کرنے کے بعد لکھنؤ میں اپنے سفر کا اختتام کیا۔ یوسف خان کا اُردو سفرنامہ جس کو ہم عجائباتِ فرنگ کے نام سے جانتے ہیں پہلی بار ''تاریخ یوسفی'' کے نام سے فارسی میں لکھا گیا، ۱۸۴۷ء میں اسی نام سے دہلی کالج کے مکتبہ العلوم سے شائع ہوا ۱۸۷۳ء میں نول کشور سے ''عجائباتِ فرنگ'' کے نام سے اردو میں چھپا، بعد میں اسی نام سے اس کے مزید ایڈیشن بھی شائع ہوتے رہے۔ سرسید احمد خان نے اپنے بیٹے کے ساتھ انگلینڈ کا سفر کیا تو ''مسافران لندن'' کے نام سے سفرنامہ لکھا سرسید نے اس سفرنامے میں انگلینڈ کے جغرافیائی اور تاریخی پس منظر، تہذیب وثقافت، رہن سہن، لباس کھانے پینے کے آداب وغیرہ کی تفصیلات دی ہیں ان کے انداز میں تحسین کا عنصر نمایاں ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کا ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' ۱۹۰۱ میں قومی پریس دہلی سے شائع ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں منشی محبوب عالم نے اپنے سفرِ یورپ کے حالات ''عجائباتِ یورپ'' کے نام سے قلمبند کیے انھوں نے مغرب کو ایک صحافی کی آنکھ سے دیکھا اور اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ''سیرِ ایران'' کے نام سے سفرنامہ لکھا، دیگر اصنافِ نثر کی طرح یہ سفرنامہ بھی آزاد کے قلم کی سحر بیانی کا شاہکار ہے: فرمانروائے بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے ۱۹۱۱ء میں ''سیاحتِ سلطانی'' کے نام سے انگلینڈ کے سفر کی تفصیلات لکھی ہیں انہوں نے بھی سرسید کی طرح یورپ کو عقیدت اور رشک کی نگاہ سے دیکھا اور یہی رنگ اس سفرنامے میں بھی نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ سر عبدالقادر نے ۱۹۲۰ میں ''مقامِ خلافت'' کے عنوان سے استنبول کا سفرنامہ لکھا۔

''سفرنامہ مظہری'' مرتبہ محمد حلیم انصاری ردولوی، ہندستان کا اندرونی سفرنامہ ہے اسے مرتب نے اپنے بھائی حاجی مظہر علیم انصاری کے روزنامچہ جات کی مدد سے لکھ کر اپنے مرحوم بھائی کے نام سے شائع کرایا ہے اور اپنا نام بطور مرتب دیا ہے۔ مرتب محمد حلیم انصاری امام اور نائب ناظم دینیات مسلمان بورڈنگ ہاؤس الٰہ آباد یونیورسٹی تھے۔ اگرچہ اس سفرنامہ پر سن اشاعت درج نہیں ہے لیکن اندرونی شہادتوں سے اس کا سن اشاعت ۱۹۲۰ کے لگ بھگ ٹھہرتا ہے۔

محمد بدرالاسلام فضلی نے ۱۹۳۴ء میں ''حقیقتِ جاپان، سیاحتِ جاپان'' کے نام سے سفرنامہ لکھا۔ فضلی کو حکومتِ ہند نے یکم نومبر ۱۹۳۰ء کو ٹوکیو اسکول آف فارن لینگوجز [درسگاہِ السنہ خارجہ] میں اردو اور فارسی کے لکچرار کے طور پر تعینات کیا۔

حسین احمد مدنی کا سفرنامہ ''اسیرِ مالٹا''، ''سفرنامہ عراق'' از بیگم حسرت موہانی، ''سفرنامہِ مصر وفلسطین'' از خواجہ حسن نظامی اور ''سفرِ حجاز'' از عبدالماجد دریابادی بھی قابلِ ذکر سفرنامے ہیں، نواب علی اختر کا سفرنامہ عراق ''زائرِ حسینؑ کا روزنامچہ'' ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی سے شائع ہوا اگرچہ سن اشاعت نہیں ہے، اندرونی شہادتوں سے بلاخوف تردید ۱۹۵۲ء کہا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۵۰ کی دہائی میں ہی بیگم اختر ریاض الدین کے سفرنامے ''سات سمندر پار'' اور ''دھنک پر قدم'' مقبول ہوئے۔ بعدازاں مستنصر حسین تارڑ نے بھی دل کھول کر سفرنامے لکھے اور یہ سلسلہ کئی دہائیوں سے جاری ہے۔

اردو سفرنامے میں ابن انشاء کا شگفتہ انداز بھی خاصے کی چیز ہے، ''ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں''، ''چلتے ہو تو چین کو چلئے''، ''دنیا گول ہے، نگری نگری پھرا مسافر'' آج تک اپنے قارئین کے ذہنوں میں تازہ ہیں اس کے علاوہ جن سفرنامہ نگاروں کو

شہرت ملی ان میں محمود نظامی (نظر نامہ)، اختر مونکا (پیرس ۲۰۵ کلومیٹر)، شفیق الرحمٰن (دجلہ)، اسلم کمال (سفر نامہ ناروے؛ اسلم کمال اوسلو میں) رضا علی عابدی (شیر دریا، جرنیلی سڑک) کشور ناہید (آجاؤ افریقہ) شامل ہیں؛ ممتاز مفتی کا سفر نامہ حج ''لبیک'' بہت مقبول ہوا۔ انسائیکلو پیڈیا وکی پیڈیا نے اسے پاکستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ایک قرار دیا ہے، (شناور بنگلہ، عمان کے مہمان، چلا مسافر سنگاپور، ذکر جل پری کا) دنیا کے سب سے زیادہ سفر نامے لکھنے والے مصنف قمر علی عباسی کے تخلیق پارے ہیں۔ اچھے یا برے سفر نامے کے بحث سے قطع نظر، جدید زمانے کے کچھ اور نام بھی ہیں جو اردو سفر نامے کی داستان میں اضافے کا باعث بنے، جن میں سعید آسی (آگے موڑ جدائی کا تھا)، امجد ثاقب (گوتم کے دیس میں) ذوالفقار احمد تابش (جوار بھاٹا)، حسن رضوی (دیکھا ہندستان)، عبدالحمید (آسٹریلیا سرزمین اور باشندے) ریاض الرحمٰن (لاہور تا بمبئی براستہ دہلی) ڈاکٹر عبدالرحمٰن خواجہ، (مشرق کا وینس) اعجاز مہاروی، (شیخ زائد کے دیس میں) محمد اعجاز (یا اللہ میں حاضر ہوں) طاہر عمران (ٹریننگ اور وادیٔ کہسار) آصف محمود (سورج دیوتا کے دیس میں) اجمل نیازی ''مندر میں محراب'' وغیرہ شامل ہیں۔

اس پس منظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے موضوع کے حوالے سے جھنگ میں لکھے جانے والے سفر ناموں کی روایت کے تجزیے سے پہلے ضلع جھنگ کا مختصر تعارف بے محل نہ ہوگا۔ جہلم اور چناب کے پانیوں سے سیراب یہ خطہ زرخیز بھی ہے اور مردم خیز بھی، سلطان العارفین، حضرت سلطان باہو جن کا نعرہ ''ہو'' اہلِ دل کی دھڑکن ہے، اس سرمایہء افتخار پر دھرتی، بجا طور پہ نازاں ہے، اسی ساندل بار میں بیتاب لہروں نے ''ہیر، رانجھا'' اور ''مرزا، صاحباں'' جیسے لازوال عشق کے موتی اچھال دیئے، جن کی آب نے الحجاز و قنطرۃ الحقیقت کے معنی آشکار کر دیئے۔ نامور مسلمان فاتح حیدر علی اور اسکے فرزند ٹیپو سلطان (۱) کا تعلق بھی اسی ضلع سے بتایا جاتا ہے۔ (۲) ہندوستان کے زیرک وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان (۳)، اور عہدِ شاہجاں کی عظیم شخصیت نواب وزیر خان (۴) جن کی تعمیر کردہ مسجد وزیر خان، لاہور میں موجود ہے، دونوں جھنگ کے مایہ ناز سپوت تھے۔ تصوف و عرفان کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے میدان میں بھی سرزمینِ ہیر کے درخشاں ستارے آسمان کے لیے بھی قابلِ رشک ہیں۔

ع سرزمینِ ہیر پہ آسماں کو بھی ناز ہے

شاعری میں باہو سلطان، مجید امجد، شیر افضل جعفری، رام ریاض، جعفر طاہر جیسے نام سامنے آتے ہیں تو نثر کی تمام اصناف میں قابلِ ذکر کام کرنے والوں کی بھی معقول تعداد جھنگ کے حوالے سے معروف ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جھنگ کے لکھنے والوں میں بطور سفر نامہ نگار محمود شام، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، ظفر اقبال بھٹی، پیر ذوالفقار احمد نقشبندی اور حاجی محمد یوسف کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ محمود شام نے ''برطانیہ میں خزاں''، ''لاڑکانہ سے پیکنگ تک''، ''بھارت میں بلیک لسٹ''، ''کتنا قریب کتنا دور، ڈاکٹر محسن مگھیانہ نے سفر نامۂ حج ''الف، میم'' اور ''دیسی ان ولایت'' ظفر اقبال بھٹی نے ''مولانا روم کے دیس میں'' حاجی محمد یوسف نے سفر نامۂ حج ''چراغِ حرم'' لکھا ہے۔

ترتیبِ زمانی کو مدِ نظر رکھا جائے تو محمود شام جھنگ کے پہلے سفر نامہ نگار ہیں [1]☆۔ ''لاڑکانہ سے پیکنگ تک'' بھٹو کے ساتھ سفر کی یادگار ہے۔ اس کیمندر جات میں سرِ آغاز، سوئیکارنو کی موت، جنگ ستمبر کی یادیں، قربانی کے لیے تیار رہو، عوامی سیلاب، دال روٹی کھائیں گے، غریبن جی پارٹی، عوام جیت گئے، ایک ایک عہد پورا ہوگا، منزل کی بشارت، ۷۰ کلفٹن، ایک پاکستان ایک سفر ڈھاکہ مذاکرات بلوچستان محروم ہے، دمادم مست قلندر اور پیکنگ میں تین روز شامل ہیں۔ سفر نامہ نگار چونکہ صحافت سے منسلک ہیں اس لیے سفر نامے میں بھی صحافیانہ رنگ غالب دکھائی دیتا ہے عبارت میں روانی ہے یوں لگتا ہے جیسے سارے منظر ابھی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہوں واقعہ کی براہ راست رپورٹنگ کا انداز ملتا ہے، ''لاڑکانہ سے پیکنگ

تک''میں ان کا اسلوب دیکھئے:

''سرِ آغاز؛ یہ کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن ہے لوگوں کا اژدہام ہے، ایک ٹرک سجا ہوا ہے نوجوان بینرز لیے کھڑے ہیں ایوب خان کے زوال کی گھڑیاں نزدیک ہیں پلیٹ فارم پر، ریلوے پل پر ہر جگہ عوام کا سیلاب ہے بولان میل آنے والی ہے بھٹو صاحب قید اور پھر لاڑکانہ میں نظر بندی سے آزادی ملنے کے بعد پہلی بار کراچی آرہے ہیں۔'' [ص ۱۷]

بعض جگہ ذو معنی جملوں کا استعمال کرتے ہیں؛

''جہاز کے باہر تاریکی تھی، اندر روشنی تھی، باہر سناٹا تھا اندر زندگی تھی جوں جوں ہم پیکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے افق روشن ہو رہا تھا، مشرق روشنی کا منبع ہے مغرب سے جتنا دور ہوں روشنی قریب آتی ہے وقت کے اعتبار سے بھی اور معنوی انداز سے بھی۔'' [ص ۱۶۰]

اکثر علامتی انداز اختیار کر لیتے ہیں مثلاً بھٹو اور مجیب الرحمٰن کی ملاقات کا منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''......اس کے بعد مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کے ڈرائینگ روم میں چلا گیا، کیمرہ مینوں نے اپنا کام جاری رکھا اس وقت تک دھڑا دھڑ تصویریں بنتی رہیں جب تک شیخ صاحب نے نہیں کہا کہ 'بس کافی ہے' سات بج کر آٹھ منٹ ہو گئے کمرے کے دروازے بند ہو گئے ہیں اب کمرے میں صرف مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان ہے مغربی پاکستان مشرقی پاکستان سے ملنے آیا ہے۔'' [ص ۱۰۴]

علامتی اسلوب کی ایک اور مثال دیکھئے؛

''اس وقت پاکستان کا قومی ترانہ بج رہا ہے جو قدم جہاں تھا وہیں رک گیا، احترام کے پیشِ نظر ۵۷ کروڑ کی قوم ۱۲ کروڑ کی قوم کا ترانہ پیش کر رہی ہے، ۱۲ کروڑ جس میں سے ۷ کروڑ دشمن کے قبضے میں چلے گئے ہیں اب ۵۷ کروڑ کا ترانہ بج رہا ہے عقیدت و احترام میں ہر شخص مؤدب و ساکت کھڑا ہے چاروں طرف دوستی اور محبت کا سیلاب ہے ۵۷ کروڑ کی قوم ۵ کروڑ کے نمائندوں کے لیے بچھی جا رہی ہے یہ محض دوستی ہے ان کے رہنماؤں نے کہا ہے کہ دوستوں کا استقبال کرنا ہے اس لیے وہ دوستوں کے استقبال کے لیے پوری محبت وخلوص سے چلے آئے ہیں۔'' [ص ۲۴]

پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کی وابستگی اور ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ جذباتی لگاؤ بھی نمایاں ہے؛

''ایمپریس مارکیٹ میں چند شہریوں نے ایوب آمریت کو قائم رکھنے کے لیے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے یہاں پتھر برس رہے ہیں آگ لگ رہی ہے جلوس کے منتظمین راستہ بدلنا چاہتے ہیں، مگر آواز آرہی ہے کہ نہیں میں اس آگ سے گزر کر جاؤں گا۔'' [ص ۱۷]

تحریر کا اُسلوب ایسا ہے کہ بعض جگہ کسی سیاسی تبدیلی جس میں جانے کتنے بے گناہوں کا خون بہا ہوگا، کتنے بے قصوروں کو جیل جانا پڑا ہوگا، کو صرف آدھے جملے میں اتنی آسانی اور بے تکلفی سے لکھ دیتے ہیں جیسے آپ میز سے ٹھنڈی پیپسی کی خالی بوتل اٹھا کر گرم چائے کا کپ رکھ دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا عبارت کا بقیہ حصہ بطور مثال دیکھئے:۔

''وہ اس آگ سے گزر چکا ہے آگ پھیل رہی ہے اب اس آگ کو روکنا مشکل ہے۔ آمریت آگ کی لپیٹ میں آ گئی ہے، چہرہ بدل گیا ہے، ایوب کی جگہ یحیٰی آ گیا ہے۔'' [ص ۱۷]

صحافی ہونے کے ناطے کہیں وہ بے جھجک حقیقت نگار بھی نظر آتے ہیں اور ان کا قلم وہ تلخ حقیقتیں بھی دکھا دیتا ہے جو ہم بہت قریب ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے:

''میں یہاں ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر سننے کی بجائے سٹیج پر بیٹھ کر اپنے ہم وطنوں کے کھردرے چہروں پر لکھی ہوئی داستانیں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، یہ داستانیں کتنی گمبھیر، کتنی خوفناک، کتنی ہولناک، کتنی دلگداز ہیں۔ یہ میرے ہم وطن ہیں، میرے وطن کی اکثریت ہیں۔ شہروں میں آرام دہ پرتکلف پر آسائش زندگی گزارتے ہوئے مجھے ان کا کبھی خیال تک نہیں آتا، حالانکہ میرا ناشتہ' میرا لنچ' میرا ڈنر ان کا مرہون منت ہے۔ ان کے سخت ہاتھ جن کی رگیں اُبھری ہوئی ہیں، ان کے بازو جنہیں قیمتی آستینیں نصیب نہیں ہیں، کھیت ان کے دم سے لہلہاتے ہیں۔ دانہ گندم ان ہی کی قوت سے پیدا ہوتا ہے، یہ تعداد میں بھی ہم شہر کے رہنے والوں سے کہیں زیادہ ہیں، مگر آسائشیں ہمارا مقدر ہیں مشقتیں ان کا مقدر۔'' [ص ۵۴، ۵۵]

کہیں کہیں جملہ ہائے معترضہ بھی در آتے ہیں اور اپنا کام دکھاتے ہیں:

''ہمارے ساتھی حکیم صاحب نے قافلے سے ہٹ کر آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن عین جہاں موڑ تھا وہاں کھڈ آ گئی ہے۔ قافلے سے الگ ہٹ کر انفرادی کوشش کا یہی انجام ہوتا ہے۔''

بلوچستان کے دورے سے واپسی کے سفر میں ان کہی بات کہہ جانے کا انداز بھی خوب ہے:

''اگلے روز ہم جہاز سے کراچی روانہ ہو گئے یہ سفر فاروق معین کیلئے تو نہایت خوشگوار تھا کہ انہیں ایک اچھا ہم سفر مل گیا ہم تو وہی محروم رہے ازلی، ابدی محروم۔'' [ص ۱۴۶]

منظر نگاری اور اسکے ساتھ خوب صورت تشبیہات و استعارات کا استعمال نثر میں شاعری کی شان پیدا کر دیتا ہے۔

''ایئر ہوسٹس کے آداب میں شامل مسکراہٹ اور شائستگی کے علاوہ میر کی غزلوں کے مطلعے اور غالب کی غزل کا بانکپن بھی تھا۔'' [ص ۱۵۸]

محمود شام کے دیگر سفر ناموں میں بھی ان کا یہی انداز و اسلوب کارفرما ہے۔ اُردو زبان و ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ سفر نامہ نگاری میں ان کی خدمات' جھنگ کی ادبی تاریخ کا اہم باب ہیں۔

''مولانا روم کے دیس میں'' ظفر اقبال بھٹی کا سفر نامہ ہے۔ یہ سرزمین ترکیہ کی دو سالہ علمی و سفری روداد ہے۔ سفر نامہ نگار بی۔ ایس۔ سی کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے لئے ترکی گئے۔ سفر نامہ داخلے سے لے کر، یونیورسٹی کے ماحول، قوانین و ضوابط اور ترکی کے مختلف شہروں کی سیر کے مشاہدات سمیت بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ جس میں قدرتی مناظر کی خوبصورتی اور ترکی کے لوگوں کے اجتماعی کردار کا تذکرہ شامل ہے۔ اس کے درج ذیل ابواب ہیں ''سفر ہے شرط، یونیورسٹی میٹو، میرا شہر انقرہ، ترکی ایک نظر میں، ایک ملک دو براعظم، میناروں کا شہر استنبول، پرندوں کے جزیرے اور اس کے گرد و نواح میں بحیرۂ ایجین کا ساحلی سفر، دیار روم میں قونیہ کا سفر، روئی کے قلعے، پاموکالے، اور ایجین کے موتی، ازمیر کا سفر، چاند کے دیس میں، سفید سمندر کے ساحلوں پر، بحیرۂ روم کے کنارے، رختِ سفر'' وغیرہ عمدہ منظر نگاری، خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال اور سادہ اسلوب، اس سفر نامے کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

''بدلیوں کی اوٹ میں سے سورج کی شرارتی کرنیں چھن چھن کر انقرہ کو گدگداتی ہیں تو پورے شہر پر قدرت کا دستِ حنائی بدلیوں کے سائے اور سورج کی دھوپ کے امتزاج سے وہ گلکاریاں کرتا ہے کہ دیکھنے والا محو حیرت ہو جاتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس گدائے بے نوا نے ایسا لباسِ دریدہ زیب تن کیا ہوا ہے جس کے چار سو چھید ہی چھید ہوں خوبصورتی کے اس منظر کو جمالیاتی حس رکھنے والا ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔'' [ص ۵۳، ۵۴]

فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ گراں محسوس ہونے کی بجائے شگفتگی کا احساس بڑھتا ہے:

''یونیورسٹی یا شہر کے مختلف حصوں کا نظارہ کریں تو تمام شہر برف میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کے گویا قدرت کے شفیق ہاتھوں نے سارے شہر پہ سفید لحاف اوڑھ دیا ہو تمام درخت اور پودے برف کا لبادہ اوڑھ کر بہت بھلے لگتے ہیں خاص طور پر صنوبر کے درخت تو قابل دید ہوتے ہیں نظر ہے کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔'' [ص ۵۵]

ترک لوگ اپنے ملک اور اپنے قومی اثاثوں کے لیے قوم پرستی کی حد تک مخلص ہیں مصنف نے پہلے ترک قوم کی ان خوبیوں کی نشاندہی کی ہے اسے سراہا ہے اور پھر اس کا موازنہ اپنی قوم کے لوگوں سے کیا ہے۔

''انقرہ کے لوگوں میں قوم پرستی کا عنصر پوری ترکی میں اجاگر ہے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ایک ہی قوم ہے۔ لسانی تعصب نام کو ہی نہیں اور نہ ہی ان سے جنم لینے والے خونی فسادات ہیں۔'' [ص ۷۰]

ترک لوگوں کو اپنے قومی اثاثوں کی حفاظت، ذاتی اثاثوں کی طرح کرتے دیکھ کر مصنف کو اپنے ہم وطن یاد آتے ہیں جو سکول، بینک اور بھری ہوئی بسیں جلا کر اپنے کارنامے پر فخر محسوس کرتے ہیں:

''قومی اثاثوں کی توڑ پھوڑ اور غارت گری کا تصور تک نہیں اس کی مثال شہروں میں لگے بیسیوں ٹیلیفون بوتھ، شیشے اور پلاسٹک کے بنے ہوئے خوبصورت بس سٹاپ، بڑے بڑے دیوپیکر شیشوں سے بنی ہوئی بڑی بڑی دکانیں سرکاری بسیں، عمارات اور اس طرح کی دیگر ہزاروں اشیاء ہیں جن کے ٹوٹنے یا چوری ہو جانے کا شاذ و نادر ہی موقع آیا ہوگا ہم جب اپنے وطن عزیز کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو فسادات اور ہنگامے کرنے والے خصوصاً نوجوان نسل سب سے پہلا کام قومی اثاثوں کی توڑ پھوڑ کا کرتے ہیں اس پر مزید بدقسمتی یہ کہ اس کام کو بہادری کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔'' [ص، ۷۱]

مصنف نے ترک قوم کے رسم و رواج کو جاننے میں گہری دلچسپی لی ہے، اور تقریبات وغیرہ کے مناظر بھی قلمبند کیے ہیں شادی کا ایک منظر دیکھئے:

''دولہا نے کالے رنگ کا وضعدار سوٹ پہنا ہوا ہے، جو سرخ رنگ کی بو سے آراستہ تھا۔ دلہن نے سر سے لے کر پاؤں تک سفید رنگ کا جالی نما عروسی لباس پہنا ہوا تھا سر پر چھوٹا سا تاج تھا۔ بہت بڑے گھیر کا یہ لباس زمین پر گھسٹتا چلا جاتا تھا، یہ عروسی لباس مکمل طور پر مغربیت کا مظہر اور عیسائیوں کے عروسی لباس کے مشابہ تھا۔ مشرقیت یا مسلمانی نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔'' [ص ۶۹]

اپنے برادر اسلامی ملک ترکی میں اسلامی اقدار کی ناقدری پر سفرنامہ نگار کا دل کڑھتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کا مرکز آج کس طرح جدیدیت، مغربیت اور آزادروی کا شکار ہے:

''یہی حکم لڑکیوں کے لئے بھی تھا وہ رومال، اوڑھنی (سکارف) پہن کر یونیورسٹی میں داخل نہیں ہو سکتیں، تاہم باپردہ لڑکیاں جو کہ گنی چنی تھیں، یونیورسٹی کے صدر دروازے سے داخل ہوتے وقت اپنا رومال اتار کر بیگ میں ڈال لیتیں اور اندر آ کر دوبارہ اوڑھ لیتیں بعد میں یہ حکم دیا گیا کہ اگر کسی کلاس روم میں کوئی لڑکی رومال اوڑھ کر بیٹھے تو ٹیچر اسے کلاس سے باہر نکال دے۔۔۔۔۔'' ڈاڑھی منڈوانے کے حکم کے بارے میں پہلے یہ سنا تھا کہ غیر ملکی اس سے مستثنیٰ ہیں لیکن بعد میں ہاسٹل میں رہنے والے پاکستانی لڑکوں کی فہرست لگ گئی جنھوں نے ڈاڑھیاں رکھی ہوئی تھیں اور جنھیں ڈاڑھیاں کٹوانے کے لئے کہا گیا تھا حکم عدولی کی صورت میں ان کو ہاسٹل چھوڑنا پڑنا تھا۔'' [ص ۸۱]

مشرقیت اور مغربیت کے ایسے ہی تضاد کا ایک اور منظر دیکھئے:

''ایک طرف مغربی طرز کی دیو پیکر بڑی بڑی عمارتیں ہیں تو دوسری طرف مشرقی طرز کے بڑے بڑے محلات اور قلعے ہیں ایک طرف سکرٹ اور پتلونوں میں ملبوس مغرب زدہ ترک خواتین ہرنیوں کی طرح دوڑتی پھرتی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف اونچے اونچے میناروں والی سینکڑوں مساجد اس خطۂ ارض میں اسلام اور مشرقی شرم و حیا کے غماز ہیں ۔۔۔ ایک طرف مسجدوں اور قلعوں کے سنہرے اور ہلالی گنبدوں سے منعکس ہوتی ہوئی سورج کی روپہلی کرنیں ہیں تو دوسری طرف نائٹ کلبوں اور شراب خانون کی رنگ برنگی جلنے بجھنے والی مصنوعی روشنیاں ہیں۔'' [ص ۱۰۵]

ساحل سمندر کی آزادروی بھی انہیں اور ان کے پاکستانی دوستوں کو مبہوت کر دیتی ہے:

''لباس کی قید سے آزاد ہو کر ہر عمر کے انگریز اور ترک مرد و زن چند چیتھڑوں کا سہارا لے کر سمندر کی اچھلتی ہوئی موجوں اور سورج کی تمازت آفریں کرنوں کو داد عیش دے رہے تھے ہمارا یہ عالم تھا کہ زبانیں گنگ تھیں اور آنکھیں پھٹی ہوئی، دوسری طرف مشرقیت اور حجاب کا عنصر بھی بار بار ٹہوکا دے رہا تھا۔ اگر ہم کسی پری وش کی طرف دیکھ رہے ہوتے تو وہ بھی کن انکھیوں سے، مبادا کوئی ہمیں لڑکیوں کو دیکھتا ہوا دیکھ نہ لے۔'' [ص ۱۴۳]

سفر نامہ نگار فطرت کے حسین مناظر کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں کہ قاری رشک سے دوچار ہو جاتا ہے:

''گو کہ دنیا میں بڑی بڑی آبشاریں موجود ہیں لیکن حسن اور خوبصورتی کے لئے بڑائی شرط نہیں ہے یہ مجھے یہاں آ کر محسوس ہوا۔ گھنے درختوں میں گھری ہوئی یہ جگہ دو پہاڑی چٹانوں کے درمیان ایک ندی کی شکل اختیار کرتی ہے جہاں پہاڑوں سے آتا ہوا ایک نالہ اس میں آبشار کی صورت گرتا ہے۔ خدا کی قدرت کہ وہی نالہ جو بہت دور سے آ رہا ہے اور جس پر کوئی نظر بھی ڈالنا گوارا نہ کرتا ہو گا اس جگہ پر آ کر اتنا ہی دلکش اور خوب صورت ہو جاتا ہے اس طرح کہ کوئی بیس پچیس فٹ کی بلندی سے سفید پانی باریک باریک لکیریں بناتا ہوا کافی چوڑائی سے ندی کے دامن میں مدغم ہو جاتا ہے۔'' [ص ۲۱۳]

مزار رومی پر حاضری کا منظر روحانیت اور عقیدت سے لبریز دکھائی دیتا ہے:

''ٹرمینل یعنی اڈے سے ''دالمش'' میں بیٹھ کر چند منٹوں میں ہم مزار رومی کی چوکھٹ پر پہنچ گئے حسبِ آداب ہمارا سب سے پہلا کام مولانا روم کی قبر مبارکہ پر فاتحہ پڑھنا تھا وہاں کچھ دیر کھڑے ہو کر اپنی عقیدت کا خاموشی سے اظہار کیا اس دوران ''نے'' یا بانسری کی مدھر سر ساتھ ساتھ رہی یہاں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ مزار کے اندر ہر وقت بانسری کی دھن ہلکی سر اور آواز میں بجتی رہتی ہے جو آنے والے عقیدت مند کو مرئی طور پر روحانیت کے گرداب میں گھیر لیتی ہے۔'' [ص ۱۷۵]

آبی گزرگاہوں، جھیلوں، خوب صورت پلوں اور جھاگ اڑاتے سمندروں اور آبی پرندوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے مصنف مطالعے سے بچ جانے والے وقت کو فطرت کی حسین کرشمہ سازیوں کے نظارے میں کھو جانے میں گزارتا ہے:۔

''جب ٹرین ایک قصبے 'ازمت' کے بعد استنبول تک بحیرۂ مارمرا کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفید جھاگ پیدا کرتی ہے، موجوں کے ہمرکاب چلتی ہے اور سمندر میں پھلتے ہوئے آبی پرندوں کی قطار در قطار ٹولیاں صبح کی سپیدگی میں ایک مصور کے تخیلات کی عکاسی کرتی ہیں۔'' [ص ۱۰۶]

پانیوں میں گھرے استنبول کے مناظر بڑے دلکش ہیں، ان کے ساتھ ہی سفر نامے میں انسان اور قدرت کے مشترکہ تخلیق کردہ لازوال مناظر کے تصویری عکس بھی موجود ہیں۔ جیسا کہ ایشیاء اور یورپ کو ملانے والے عظیم پل باسفورس اور

غلاطہ پل کے مناظر کی تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں:

''قدیم استنبول تین اطراف سے پانی میں گھرا ہوا ہے اس کے شمال میں ایک چھوٹی سی خلیج ہے جس کو گولڈن ہارن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مشرق اور جنوب میں بحیرہ مارمرا، اور آبنائے باسفورس ہیں جبکہ مغرب میں لامتناہی خشکی، گولڈن ہارن آبنائے باسفورس سے ایک شاخ کی صورت دور تک خشکی میں چلا جاتا ہے جہاں پر ایک دریا اس سے آکر مل جاتا ہے۔'' [ص۱۰۴]

بحیثیت مجموعی یہ سفرنامہ اچھے سفرناموں میں شامل ہونے کا مستحق ہے۔

''دیسی ان ولایت'' ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا انگلینڈ کا سفرنامہ ہے جہاں وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں پیپا ٹائٹس پر اپنا مقالہ پیش کرنے کی غرض سے گئے تھے۔ سفرنامہ شروع سے آخر تک دلچسپی کا حامل ہے۔ اس کا اندازِ بیان بے تکلف ہے جیسے کوئی بزرگ امزے لے لے کر بچوں کو کہانی سنا رہا ہو۔ میڈم تساؤ کے عجائب گھر کی سیر کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نوجوان حسینہ سرِ عام بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ نین نقش نہایت دلکش ہیں وہ گہری نیند میں ہے اب تک ہم نے چلتی حسیناؤں کا دیدار تو کیا تھا مگر یوں گہری نیند میں سوئی کسی حسینہ کی زیارت نہیں ہوئی تھی، ہم نے غور سے دیکھا کہ کہیں یہ مجسمہ تو نہیں مگر اس کی چھاتی تو ہر سانس کے ساتھ اوپر ابھر رہی تھی ہم نے ابھی اسے خوابوں کی شہزادی کہنے کا سوچا ہی تھا کہ ساتھ sleeping beauty لکھا پایا۔۔۔لیکن افسوس بھی ہوا کہ مصنوعی سانس چلا کر ہمیں دھوکا دیا گیا۔'' [ص۱۶۳]

پنجابی زبان کے الفاظ کا استعمال مصنف کا خاص انداز ہے کبھی ایک آدھ لفظ سے کام چلاتے ہیں اور کبھی پورا جملہ، مگر سلیقے سے:

''میانمار کے شہر میں ۹۲ ٹن وزن کی ایسی گھنٹی موجود ہے جو بجتی بھی ہے لیکن اس کو بجانے کے لئے ساگوان کا بہت بڑا شہتیر استعمال ہوتا ہے نہ جانے اتنا اوکھا ہو کر گھنٹیاں بجانے میں کیا سواد آتا ہے۔'' [ص۹۸]

''ویسے تو کمپیوٹر کی طبیعت بڑی حساس ہوتی ہے، چھوٹی چھوٹی باتیں بھی مائنڈ کر جاتا ہے پہلے پہل تو آپ کو آرام سے سمجھائے گا اور کہے گا bad command پھر اس کے الفاظ ہر چھیڑ خوانی کے بعد ذرا سخت ہوتے جائیں گے وہ تو شکر ہے کمپیوٹر پنجابیوں نے ایجاد نہیں کیا ورنہ ہر غلطی پہ ایک گالی لکھی آجاتی پہلے آرام سے bad command کی جگہ پہ لکھا آتا ''توں غلط پنگا لے ریا ایں'' وقت کے ساتھ ساتھ پھر الفاظ میں شدت آتی جاتی۔'' [ص۸۷]

مزاحیہ انداز مصنف کے اسلوب کا خاصہ ہے۔ یہ ان کی دیگر کتابوں ''چھیڑ خانی'' اور ''انوکھا لاڈلا'' میں بھی ملتا ہے۔ اس سفرنامے میں بھی ان کا مخصوص مزاحیہ اُسلوب جاری وساری ملتا ہے۔ ''شرلاک ہومز کے محلے میں'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اصل میں تو ڈاکٹر، ڈاکٹر ہی ہوتا ہے نہ مرد ہوتا ہے نہ عورت ہوتی ہے، اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ ہماری سیکس کے بارے میں کنفیوز ہو جائیں اصل بات تو یہ ہے کہ مریض دیکھتے ہوئے ڈاکٹر اپنے ذاتی جذبات پر قابو رکھتا ہے تبھی تو کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سیکس نہیں ہوتی (مگر دورانِ معائنہ، مریض) لیکن اس سے یہ بھی مراد نہیں کہ یہ تیسری مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں۔'' [ص۸۷]

کہیں کہیں جملہ ہائے معترضہ بھی در آتے ہیں۔ انگلینڈ کی سڑکوں کی وحدت کی بات کرتے کرتے اپنے یہاں کے ٹھیکیداروں پر بھی طنز کرتے ہیں:-

''ایک ہم ہیں کہ ہماری سڑکیں آٹھ لین کی بجائے اکثر وحدت کا سبق الاپتی نظر آتی ہے اور اس وحدت میں

بھی ایسی ہی دراڑیں پڑی ہوتی ہیں جتنی ہماری خدا کے واحد ہونے کے یقین میں ہیں..... ہمارے پیارے ملک میں تو سڑکیں صرف اسی وقت جوڑی جاتی ہیں جب وہاں سے کسی اہم شخصیت نے گزرنا ہے یا کسی اہم شخصیت نے اس کے ٹھیکے میں سے کچھ کھانا ہو۔'' [ص۲۴۲]

سفر نامہ نگار واقعاتی مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ کسی صورتحال کی مناسبت سے کوئی دلچسپ واقعہ بھی اگر حافظے میں موجود ہو تو بیان کر کے سفر نامے میں شگفتگی کا عنصر پیدا کر دیتے ہیں۔

''ہم نے پہلے ساؤتھ سٹیشن جانا تھا اور ٹرین میں بیٹھ کر اپنے مقام سے تھوڑا آگے نکل جانا تھا پھر وہاں سے معمولی سا سفر نارتھ باؤنڈ ٹرین پر کر کے ویسٹ منسٹر پہنچنا تھا اس سے ہمیں وہ صاحب یاد آئے جو غلطی سے اتھلیٹ تھے اور جن کے گھر سے چور چوری کر کے بھاگا تو انھوں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی چور بھی اتھلیٹکس میں کوئی پوزیشن ہولڈر تھا اس لیے خاصہ تیز بھاگ رہا تھا صاحب خانہ اس غصے میں کہ چور ان کے ساتھ بھلا ریس کیسے لگا سکتا ہے دوڑتے ہوئے اس سے آگے نکل گئے، وہ اتنا آگے نکل گئے کہ واپس مڑ کر دیکھا تو چور بھاگ چکا تھا تاہم پھر بھی وہ خوش تھے کہ مقابلہ جیت گئے، چوری کا کیا ہے جی داروں کے گھر ہوتی ہی رہتی ہے۔'' [ص۹۳]

سفر نامہ میں اپنے مخصوص انداز کے ساتھ ''لاہندی پنجابی'' کا استعمال جہاں شگفتگی کے عنصر کو بڑھاتا ہے وہاں مقامی رنگ کو بھی نمایاں کرتا ہے، لندن میں ایک ہوٹل کے استقبالیہ کے کارکن سے کہتے ہیں:

''اتنے دنوں سے تو یہاں بھبھڑاں بھوں (ویرانی) ہے، خیر اسے بھبھڑاں بھوں کی کیا خاک سمجھ آتی یہ تو خالص جھنگ کی پنجابی کا لفظ تھا۔''

سفر کے اختتام پر جب یہ دیسی ولایت سے لوٹتا ہے تو اسے اپنے وطن کی صاف ترین سڑکیں بھی میلی نظر آنے لگتی ہیں اور اپنے وطن کی دُھول نے اس لندن پلٹ مسافر کی ناک میں دم کر دیا:-

''جب ہماری گاڑی اپنے گھر کو جا رہی تھی اور ہمیں یہاں کی صاف ترین سڑکیں بھی میلی لگ رہی تھیں تو دھول اڑنا اور محسوس ہونا شروع ہو گئی۔ ناک میں آخر دم کرنے کے لیے گرد کے ذرات ہماری ناک میں آن پہنچے اور ہم چھینکیں مارنے ولایت سے اپنے دیسی گھر کی طرف تیزی سے رواں کہ گھر والے لندن پلٹ کی زیارت کو بے قرار ہوں گے۔''

مصنف کے پنجابی لب و لہجے اور مزاحیہ اسلوب میں اس سفر نامے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا سفر نامہ حج ''الف، میم'' کے مقدمے میں باقی احمد پوری نے لکھا ہے:-

''الف' میم'' میں اپنے رب سے ملاقات کی خواہش' اپنے سوالات کے جوابات کی جستجو' اپنے دکھوں پر شکایت' محرومیوں کا شکوہ' پے در پے وقوع پذیر ہونے والے سانحات کے خلاف صدائے احتجاج، انسان اور خدا کے درمیان ایک فرینک مکالمہ بن کر قاری کے سامنے آتے ہیں۔''

محمود شام نے ''الف، میم'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے ''شاہکار سفر نامہء حج'' قرار دیا ہے۔ پنجابی الفاظ کا استعمال، معاشرتی طنز و تجزیہ، بے تکلف انداز اور دلکش منظر نگاری اس سفر نامے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کا اندازِ تحریر ہلکا پھلکا ہے:

''بیس ریال بچاؤ مہم شروع ہو چکی تھی۔ پہلے چچا خضر نے ہمارا سر مونڈ کر ثوابِ دارین حاصل کیا، ان دنوں ایک ریال سولہ روپے کا تھا، ہم نے حساب لگایا، ان دس ریالوں میں ہم پاکستان میں اپنے پسندیدہ نائی سے چھ ماہ بال ترشوا سکتے تھے۔'' [ص۳۲۷]

چھوٹی چھوٹی دلچسپ حکایات شگفتگی میں اضافہ کرتی ہیں، خانہ کعبہ کو دیکھ کر لکھتے ہیں ہمیں سرگودھا کی وہ سادہ لوح مائی یاد آتی ہے جس نے کہا تھا:

''اللہ میاں! ایک تو، تو نے اتنی دور گھر بنایا ہے اور وہ بھی چھوٹا سا، تو نے مجھے حکم دیا ہوتا تو میں سرگودھا میں تیرا گھر بناتی اور دس کے دس مربعے تیرے نام کر دیتی تا کہ تو ایک بڑا سا گھر بناتا۔'' [ص ۷۶]

روحانی کیفیت کے عنوان سے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ اس سفرنامے کے چھوٹے چھوٹے ابواب پر کہیں افسانے کی کیفیت ملتی ہے، کہیں رپورتاژ کی خاصیت موجود ہے جب روح کی سرشاری کا ذکر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے محسن مگھیانہ نے آپ کی انگلی پکڑ لی ہے اور وہ خود معلم کی صورت میں آپ کو حج کے مختلف مراحل طے کرا رہے ہیں، اس روحانی کیفیت کی مثالیں ہمیں الف، میم میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں غارِ ثور میں جا کے دل کی جو کیفیت ہوئی اسے یوں بیان کرتے ہیں:

''کیا ہم اسی جگہ پر بیٹھے ہیں آپؐ جہاں بیٹھے ہوں گے ان سوچوں نے جسم و جان پہ نشے کی سی کیفیت طاری کر دی، سرور کے گہرے سمندر میں ایسے غوطہ زن ہوئے کہ اپنی ہوش نہ رہی.... آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، یہ آنسو کیوں اور کیسے نکل رہے تھے ہمیں اس کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ ہمارا وجود غارِ ثور کی فضا میں تحلیل ہو چکا تھا۔'' [ص ۲۵۵]

بے تکلفی اور شوخیٔ تحریر کا انداز کہیں کہیں معصوم گستاخی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے:

''تھوڑی دیر میں مکے کے گورنر تشریف لائے اور غسل کعبہ کی رسم شروع ہو گئی اب ہم ذرا ہوش میں آ چکے تھے، کالے حجرے کے دروازے کے اندر جھانکا شاید اللہ میاں کی ایک جھلک نظر آئے ڈرتے بھی تھے کہ حضرت موسیٰ اللہ کی ایک تجلی کی تاب نہ لا سکے ہم بھلا کس کھاتے میں تھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے بھی دروازے کے اندر جب کچھ نظر نہ آیا تو بے اختیار بولے 'میرے رب تیری مہربانی کہ تو نے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا ہے مگر یہ کیسی ملاقات ہے کہ تو خود گھر سے غائب ہو گیا ہے۔'' [ص ۲۲۵]

پنجابی الفاظ کے بے ساختہ استعمال کی مثال ملاحظہ ہو:

''غسل کے بعد نواں نکور سرا اور تازہ جسم نکل آیا۔'' [ص ۳۴۷]

طواف کا حال بیان کرنے کے لیئے جو سرخی جمائی ہے وہ ہے ''گول گیڑے''۔ [ص ۲۵۶]

سفرنامہ نگار کی تخیل آمیزی نے واقعات کے بیان کو نکھار دیا ہے:

''یہ چھوٹا سا بازار ختم ہوا تو کیا دیکھتے ہیں سامنے حرم پاک کی رعب دار عمارت کھڑی ہے وہی جس نے چلتی بس میں ہمیں جھانکا تھا، اچانک یوں لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو، آخر آ ہی گئے ہو ناں! ہم نے ادھر ادھر جھانکا کہ کہیں کوئی واقف تو نہیں نکل آیا جو ہمیں پکار رہا ہو پھر احساس ہوا یہ تو دلوں کے واقف کی آواز ہے۔'' [ص ۴۷]

منظر نگاری واقعیت پسندی اور سادگی کے ساتھ ساتھ دلی جذبات کی بھی ترجمانی کرتی ہے:

''ہم ساری عمر جس قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے آ رہے ہیں، وہ آج ہمارے سامنے تھا۔ ستاروں بھرے آسمان کے نیچے برقی قمقموں کی جگمگاتی روشنیوں میں اللہ کا گھر بڑے طمطراق سے کھڑا تھا، اس پہ لکھی سنہری آیات ہمارے دل پہ رقم کسی دعا کی طرح جھلملا رہی تھیں۔'' [ص ۷۵]

مصنف حساس دل کے مالک ہیں جب وہ احرام پوش حجاجِ کرام کو کمروں کے حصول کی خاطر دھکم پیل کرتے

دیکھتے ہیں تو ان کا قلم طنزیہ انداز اختیار کر لیتا ہے:-

''بلڈنگ کی اس انتظار گاہ میں عجیب آپا دھاپی کا منظر تھا لگتا تھا کہ سب بھول چکے تھے کہ وہ حج کرنے آئے ہیں، وہی خودغرضی کا ماحول، وہی دھکم پیل، دوسروں سے پہلے کمرہ لینے کی تگ ودو شاید یہ مسلسل سفر کی تھکاوٹ کا اثر تھا جس نے لوگوں کی اصلیت پھر سے سامنے لا کر کھڑی کر دی تھی تھوڑی دیر پہلے دین دین پکارنے والے اب دنیا دنیا پکار رہے تھے۔'' [ص ۴۳]

بحیثیت مجموعی یہ سفر نامہ ذاتی نقطہ نظر کا حامل اور منفرد ہے' روایتی سفر ناموں سے مختلف ہے۔ مصنف کی مخصوص شگفتہ بیانی اور شوخی و بے تکلفی نے اس مقدس سفر میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی کا سفر نامہ ''لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند'' مصنف کی ان سفری یادداشتوں پر مشتمل ہے جن کا آغاز ۲۲ اپریل ۱۹۹۲ء بروز بدھ لاہور سے ہوا تھا۔ ناشر ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی کے مطابق یہ سفر نامہ ان جیسے ارادت مندوں کے مسلسل اصرار پر سپرد قلم ہوا:

''بس ایک دن حضرت کی جولانیٔ طبع میں طغیان آیا تو وسط ایشیاء کی آزاد ریاستوں اور رشیاء کے حالات سفر لکھنے شروع کر دیئے، مضمون آتا گیا، داستان بنتی گئی، سیلانِ قلم جو چلا تو آٹھ سال پرانے سفر کو یوں لکھ دیا جیسے ابھی دورہ کر کے آئے ہوں باوجود اپنی تبلیغی مصروفیات کے تھوڑے ہی دنوں میں تقریباً تین سو صفحات قلمبند کر دیئے۔''

اسی تناظر میں مصنف نے اپنے سفر نامے کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے:-

''تقریباً سات سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی احباب کا مطالبہ کم ہونے کی بجائے الٹا زور پکڑتا گیا حتی کہ فقیر نے اللہ کا نام لے کر کاغذ قلم سنبھالا جو کچھ ذہن میں آیا اسے بلا کم و کاست کاغذ پر منتقل کر دیا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ زبان عام فہم اور اتنی سلیس ہو کہ پانچویں جماعت کا طالبعلم بھی اسے پڑھ کر فائدہ حاصل کر سکے۔''

سفر نامہ ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کو ایک مخصوص نام دیا گیا ہے، ہر باب میں چھوٹی چھوٹی سرخیاں ہیں پہلے باب 'پس منظر' میں ایک ارادت مند منیر احمد کا خط نقل کیا ہے، جو نماز تہجد کے بعد مراقبے میں تھے کہ ان سے کسی نے پوچھا یہ کون ہے؟ انہوں نے جواباً کہا ''یہ میرے پیر و مرشد حضرت ذوالفقار احمد صاحب ہیں'' آواز آئی ''ان کو رسول ﷺ کا پیغام دے دو کہ ۷۵ دن کے لیے سویت یونین چلے جائیں۔'' [ص ۱۴]

یہیں سے کشف و کرامات اور خوارق عادات کا لامتناہی سلسلہ چلتا ہے جو اس سفر نامے کی سب سے بڑی کمزوری ہے، اور یوں یہ سفر نامہ، عوام سے زیادہ خواص کے استفادہ کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ تاشقند میں قیام کے دوران مصنف کو ''داداخان نوری'' کی خدمات میسر آتی ہیں جو شاعر اور ادیب تھے اور اردو زبان بڑی روانی سے بولتے تھے انھوں نے مفتی اعظم ازبکستان سے مصنف کی ملاقات کرائی، ازبک ٹی وی فنکارہ حلیمہ خاں کو بھی ساتھ لے لیا گیا جس نے فرط عقیدت سے ''فقیر' کے کندھوں کو ہاتھ لگایا اور کپڑوں کو ہاتھ لگا کر اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے اس سفر نامے میں جگ جگہ مصنف کی کرامات کے واقعات بیان کیے گئے ہیں دورانِ پرواز ایک پاکستانی دہریے سے بحث ہوئی جس کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے:

''فقیر کے یہ توجہ بھرے الفاظ اس دہریے پر بجلی بن کر گرے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کہنے لگا مولانا میں توبہ تائب ہو کر نئے سرے سے مسلمان ہوتا ہوں۔'' [ص ۲۴]

کہیں مصنف پیر کے روپ میں نظر آتے ہیں اور دوسری طرف عاجزی کا یہ عالم کہ پورے سفر نامے میں اپنے لیے فقیر کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی مناسبت سے کلمات بھی ادا کرتے ہیں اور اس پہ طرہ یہ کہ اظہارِ کرامات کے ساتھ یوں بھی کہہ لیتے ہیں:

''اگلے دن حلیمہ خان نے پیغام بھجوایا، کہ میں آپ کے متعلق ٹی وی پروگرام دینا چاہتی ہوں فقیر نے کہا ہمارے بڑوں نے ہمیں چھپنے کی نہیں چھپنے کی تعلیم دی ہے۔'' [ص ۳۱]

ان خامیوں کے باوجود اس سفر نامے کے کئی مثبت پہلو بھی ہیں اگر چہ اس میں مکالمے بہت کم ہیں لیکن مصنف کا انداز بیان سادہ ہے اور جہاں بھی فارسی اشعار نقل کیے ہیں، قارئین کی سہولت کے لیے اُردو ترجمہ بھی دیا ہے جہاں آیات شامل کی ہیں ان کا ترجمہ بھی دیا ہے احادیث سے بھی مدد لی ہے اور مناظر کی تصویر کشی بھی عمدہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ سفر نامہ مریدین کی تعداد بڑھانے کی خواہش کا پس منظر بھی لیئے ہوئے ہے۔

جھنگ سے ہی حاجی محمد یوسف نے ''چراغِ حرم'' کے نام سے اپنے سفر حج کی روداد لکھی ہے۔ اور اس کا نام ''چراغِ حرم'' رکھا۔ یہ سفر نامہ مصنف کی متعدد تصانیف میں سے ایک ہے جن پر وہ اپنی عمر کے آخری دنوں میں کام کر رہے تھے۔ حسبِ عادت جو کاغذ بھی ہاتھ لگتا اس پر لکھتے جاتے اب وہ اوراقِ منتشر گڈ مڈ ہو چکے ہیں اور ورثاء ان کو الگ کرنے اور ترتیب دینے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں جہاں تک ان کے سفر نامہ حج کا تعلق ہے اس کا مسودہ ان کی کوئی عزیزہ جو لاہور میں مقیم ہیں، بغرضِ ترتیب وطباعت اپنے ساتھ لے گئی تھیں، مگر اب تک انہوں نے مسودہ واپس کیا ہے اور نہ ہی چھپوایا ہے۔ ان کے گھر پر موجود اوراقِ منتشر میں سے اس سفر نامہ حج کے حوالے سے مصنف کا صرف قلمی ''ابتدائیہ'' ہی مل سکا ہے۔ جس سے ان کی لگن، عقیدت اور سوز وگداز کا واضح اظہار ہوتا ہے یہ ابتدائیہ ان کے مرصع ومکلّف طرزِ تحریر کا غماز ہے:

''میں اپنی انتہائے نگارش کی ابتدا اس رحیم وکریم اور علیم وخبیر کی ذاتِ احدیت کے نام سے کرتا ہوں، تا کہ وہ میرے قلم کو بہار آفرین بنادے اور سفر حرمین کی سرگزشت رقم کرنے کی توفیق بخشے، میری تمنا ہے کہ یہ تاریخی دستاویز اسلامی ادب وانشاء پردازی کا عظیم شاہکار بنے، میرے درد بھرے تاثرات میری طلبِ صلاحیت کے آئینہ میں مرتسم ہو کر ایک ایسے چراغِ راہ کی صورت اختیار کر لیں جسے خونِ جگر کی تپش، قربانی وایثار اور تقوی کے جذبات اور نورِ ایمان کی حرارت اور عقیدت ومحبت کی لو سے روشن کیا گیا ہو۔'' [ابتدائیہ قلمی ص ٦]

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اردو سفر نامہ کی روایت پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ اس عرصہ میں بیسیوں سفر نامے سامنے آچکے ہیں۔ اس روایت میں جھنگ بہت تاخیر سے شامل ہوا۔ چنانچہ ابھی اسے بہت سا سفر طے کرنا ہے۔ اگر اہل جھنگ کی مجموعی علمی ادبی خدمات کو ذہن میں رکھیں تو سفر نامہ میں جھنگ کا حصہ بلحاظِ مقدار بہت کم ہے، اور بلحاظ معیار بھی ابھی اسے بہت سی منازل طے کرنا ہیں۔ شگفتگی اور سنجیدگی دونوں سفر نامہ کے لئے ناگزیر ہیں بڑا سفر نامہ انہی کے حسنِ امتزاج سے وجود آتا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ آنے والے برسوں میں یہ حسنِ امتزاج جھنگ کے خطے سے بھی بڑے سفر نامے سامنے لائے گا۔

حوالہ جات/ حواشی

۱۔ بلال زبیری ''تاریخ جھنگ'' جھنگ ادبی اکیڈمی جھنگ صدر ۲۰۰۲ء ص ۳۰۹

۲۔ ڈاکٹر ارشاد احمد تھہیم ''تاریخ چنیوٹ ادارہ اشاعت ندار دا پریل ۲۰۰۵ء ص ۲۴۰، ۲۴۱

۳۔ ''تاریخ جھنگ'' ص ۱۳۹

۴۔ ''تاریخ چنیوٹ، ص ۲۵۷

☆۱ محمود شام مصنف، شاعر اور صحافی ہیں، ۴۸ سال سے صحافت میں ہیں۔ پاکستان کے ان صحافیوں میں سے ہیں جنھوں نے بہت سفر کیا۔ دو مرتبہ جیل جا چکے ہیں، بیس سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں بھارت گئے، واپسی پر ''کتنا قریب، کتنا دور'' کے عنوان سے بھارت کا سفر نامہ لکھا۔ بھٹو کے ساتھ ۱۹۷۲ء میں چین گئے شملہ معاہدے میں بھٹو کے ساتھ تھے۔ ۱۹۷۵ء میں امریکہ اور فرانس گئے، ۱۹۷۷ء میں بھٹو کے ساتھ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، لیبیا اور فرانس گئے، بھٹو، بینظیر اور مشرف کے ساتھ دوروں میں شریک رہے۔ ۱۹۶۰ء میں کارڈیو سپارم کے عنوان سے انگریزی میں پہلی طویل نظم لکھی۔ پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''چہرہ چہرہ پری کہانی''، ''آخری رقص''، ''نوشتہ دیوار'' (۱۹۸۰ء)، ''قربانیوں کا موسم'' (۱۹۹۱ء)، ''محلوں میں سرحدیں'' (۱۹۹۹ء)، روبرو ان کے کیے ہوئے انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ روزنامہ جنگ کے گروپ ایڈیٹر ہیں۔ عالمی سطح کے لیڈروں مثلاً جیرالڈ فولڈ، ہندوستانی وزیر اعظم اندرا گاندھی، تنا عبدل رزاق آف ملائیشیا کا انٹرویو کیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۷۷ء کو گرفتار ہوئے اور اکتوبر (۱۹۷۸ء) کو ۹۰ دن کے لیے نظر بند کیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں بھٹو کی سوانح عمری لکھی۔ بینظیر بھٹو کے پالیسی بیانوں کا مجموعہ ''داوے آؤٹ'' اور اسکا ترجمہ ''ایک ہی راستہ'' کے نام سے شائع کیا۔ ''تقدیر بدلتی تقریریں'' قائدِ اعظم سے لے کر بینظیر تک راہنماؤں کے قوم سے خطابوں کا مجموعہ ہے۔ ۱۹۹۵ء سیاسی ناول ''شب بخیر'' لکھا۔ ''بھارت میں بلیک لسٹ'' (۱۹۷۷ء) کے سفری تاثرات کا مجموعہ ہے۔

☆۲ ظفر اقبال بھٹی ۲۲ مارچ ۱۹۵۸ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم جھنگ میں حاصل کی بعد ازاں پی اے ایف کالج سرگودھا سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی کا مرحلہ طے کیا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے سول انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دستِ قدرت انھیں ترکی لے گیا جہاں انھوں نے مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی انقرہ سے ماحولیاتی انجینئرنگ میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی ''مولانا روم کے دیس میں'' مصنف کی ترکی میں دو سالہ عملی سفری یاداشتوں کا مجموعہ ہے۔ اب تک یہ واحد تصنیف ہی ان کی شناخت کا باعث ہے۔

☆۳ ڈاکٹر محسن مگھیانہ یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے، اپنے تعلیمی سفر کے دوران گورنمنٹ کالج جھنگ اور پنجاب میڈیکل کالج، فیصل آباد کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ادبی مجلّات میں ان کی غزلیات، افسانے، مضامین وغیرہ چھپتے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج جھنگ کے مجلّے "کاروان" اور پنجاب میڈیکل کالج، فیصل آباد کے ادبی رسالوں "شاہین"، "پرواز" کے طالب علم مدیر بھی رہے۔

ان کی اردو اور پنجابی تصنیفات میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

''انوکھا لاڈلا''	اردو آپ بیتی	''بھنیری''	پنجابی طنز و مزاح
''چھیڑ خانی''	اردو طنز و مزاح	''دیسی ان ولایت''	اردو سفر نامہ
''انیندرے''	پنجابی افسانے	''اٹھیلیاں''	اردو طنز و مزاح

''چنتا'' پنجابی انشائیے ''یہ کیسی محبت ہے'' اردو شاعری

''سفر نامہء حج الف، میم'' اردو سفر نامہ ''مسئلہ ہی کوئی نہیں'' اردو طنز و مزاح

☆۴ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں جھنگ سے میٹرک کیا۔ ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونیوسٹی سے بی ایس سی کی۔ ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا حصول بھی جاری رہا۔ ۱۹۷۶ء میں بی ایس سی الیکٹریکل انجینئرنگ کی۔ سعودی عرب، مصر، سنگاپور، تھائی لینڈ، ہندوستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، سویڈن، آسٹریلیا، ڈنمارک، فرانس، امریکہ، روس، فن لینڈ سمیت کئی ملکوں کے تبلیغی دورے کیے ہیں۔ ان کی اُردو تصانیف درج ذیل ہیں:۔

''عشقِ الٰہی'' ''عشقِ رسول'' ''تصوف وسلوک'' ''کتنے ہیں حوصلے پروردگار کے''

''موت کی تیاری'' ''باادب بانصیب'' ''خطباتِ فقیر'' ''حیاتِ حبیب''

''مجالسِ فقیرؒ'' ''مکتوباتِ فقیرؒ'' ''قرآن کے ادبی اسرار ورموز''

☆۵ حاجی یوسف مرحوم تحریک آزادی کے فعال رکن اور جھنگ کے معروف سماجی کارکن تھے قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آباد کاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ریٹائرڈ فوجی کی حیثیت سے جھنگ میں سولجر بورڈ کی شاخ بنوانے کے لیے فعال کردار ادا کیا حاجی یوسف شاعر بھی تھے اور ان کی نثری تحریریں مقامی اخبارات میں متواتر چھپتی تھیں مذہبی موضوعات پر مضامین لکھا کرتے تھے، انھوں نے ۱۹۸۸ء میں حج کی سعادت حاصل کی اور اپنے سفر حج کے تاثرات کو سفر نامے کی صورت میں قلمبند کیا۔ قلمی صورت میں اس کے منتشر اجزا موجود ہیں۔ کوئی بھی تصنیف کتابی صورت میں نہ ہے۔

کتابیات

۱۔ اختر ریاض الدین، ''دھنک پر قدم''، نسیم بک ڈپو لاہور ۱۹۷۶ء

۲۔ بدرالاسلام فضلی، محمد، ''حقیقت جاپان، سیاحت جاپان'' ادارہ اشاعت ندارد، ۱۹۳۴ء

۳۔ ذوالفقار احمد نقشبندی، پیر، ''لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند'' مکتبہ الفقیر، فیصل آباد ۲۰۰۰ء

۴۔ شبلی نعمانی، ''سفر نامہء روم ومصر وشام''، قومی پریس دہلی، ۱۹۰۱ء

۵۔ ظفر اقبال بھٹی، ''مولانا روم کے دیس میں''، مکتبہ علمیہ لاہور ۱۹۹۰ء

۶۔ علی اختر، نواب، ''زائرِ حسین کا روزنامچہ''، ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی، سن ندارد

۷۔ محسن مگھیانہ، ڈاکٹر، ''دیسی ان ولایت، جہانگیر بک ڈپو لاہور، ۱۹۹۷ء

۸۔ محسن مگھیانہ، ڈاکٹر، ''الف میم'' (سفر نامۂ حج)، جہانگیر بک ڈپو لاہور، ۲۰۰۰ء

۹۔ محمود شام، ''لاڑکانہ سے پیکنگ تک'' نیشنل فورم سنٹرل ایریا پی، ای، سی، ایچ سوسائٹی کراچی، ۱۹۷۲ء

۱۰۔ مظہر علیم انصاری، حاجی، ''سفر نامۂ مظہری''، مرتبہ محمد حلیم انصاری، ناقص الاول، ادارہ وسن اشاعت ندارد

ONLINE REFERENCES

Degital Library of India

www.wikipedia.com

www.new.dli.emet.in/scripts/FullindexDefault.htm&last=271&bracode=2990110005497.?
path1=/data/upload/005/501%first=1

www.mehmoodsham.com/